ڈاکٹر محمد ریاض

شبلی نعمانی کی اُردو و فارسی شاعری

علامہ شبلی نعمانی کی گوناگوں علمی اور ادبی خدمات میں ان کی اردو و فارسی شاعری بھی شامل ہے۔ شبلی کے اس پہلو کی اہمیت ثانوی سہی، مگر ان ایسے جامع کمالات شخص کا ہر پہلو قابلِ توجہ ہے۔ انھوں نے اردو اور فارسی میں تسنیم، شبلی، نعمانی اور شبلی نعمانی کے تخلص کے ساتھ کوئی چار ہزار شعر لکھے ہیں جو دونوں زبانوں میں تقریباً مساوی تعداد میں ہیں۔ ان کے کلام کے مختلف مجموعے اور انتخاب چھپتے رہے مگر وہ ان کی شاعری کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہیں۔

شبلی نے سنجیدگی سے کبھی شاعری نہیں کی مگر چونکہ وہ موزوں طبع ہونے کے ساتھ ساتھ بنایت حساس واقع ہوئے تھے، اس لیے فوری واقعات سے تاثر لیتے اور اسے زبانِ شعر میں کہہ ڈالتے تھے۔ یوں بھی ادبی و علمی محافل میں وہ اشعار سے گرمی پیدا کرتے اور اس طرح تفننِ طبع کے علاوہ ایک مفید خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار کو اپنے علمی مقام سے فروتر جانا اور بعض اوقات اسے ہرزہ بافی[1] سے تعبیر کیا، مگر اپنے مقامِ شعر کے بارے میں انھوں نے فخریہ اشعار بھی لکھے ہیں۔ مثلاً:

بہ آب و رنگِ نظمِ خویشتن نازد چناں شبلی — کہ در اقلیمِ معنی کہنہ استاد است پنداری

بزم را دید کہ از نغمۂ دوشینہ تہی است — شبلی آں زمزمہ را باز ز آغاز گرفت

---

[1] اپنے مجموعہ کلام فارسی، دستۂ گل کے ترتیب دینے کے ضمن میں شبلی نے سید حامد حسین بیدل شاہجہانپوری کے اصرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

ہرزۂ چند بہم بافتن پیش کسان — عرضہ دادن، نہ پسندیدۂ عاقل باشد

من ہم ایں کار نمی خواستم از اوّل، اما — چہ تواں کرد چو فرمودۂ بیدل باشد

شیرِ عرینِ سخن مدرسۂ سبز بیان   نادرۂ روزگار شبلیِ نام آورم

حقیقت یہ ہے کہ تغزل، زورِ بیان، فصاحت و بلاغت اور دینی و سیاسی مباحث کے لحاظ سے ان کی شاعری خاص اہم ہے۔

اردو شاعری

شبلی کی اردو شاعری کا آغاز ان کے زمانہ طالب علمی میں ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۳ میں جب وہ مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں تدریس کے لیے مامور ہوئے اور ایک وسیع تر علمی ماحول میں داخل ہوئے تو ان کی اردو نیز فارسی شاعری کے جوہر روشن تر ہونے لگے۔ شبلی مدت العمر شاعر رہے۔ البتہ مختلف ادوارِ حیات میں ان کی شاعرانہ تخلیقات میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری تغزل، توصیف، تاریخِ اسلام کے بعض واقعات، عالمِ اسلام کے معاصر واقعات، معاصر سیاسی معاملات اور بعض ذاتی تاثرات پر مشتمل ہے۔ عالمِ اسلام کے حوادث، قدیم و جدید تعلیم کا ارتباط اور احیاء المسلمین دیگر موضوعات ہیں جن پر شبلی نے کافی لکھا ہے۔ اصنافِ شاعری کے اعتبار سے شبلی کی اردو شاعری میں مثنوی، مسدس، قطعے اور ترکیب بند زیادہ نظر آتے ہیں۔ چند غزلیں انھوں نے ۱۸۸۳ اور ۱۸۸۴ میں لکھی تھیں مگر ان کے متعلق سید سلیمان ندوی مرحوم کے اس قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "ان غزلوں میں سوائے غزل ہونے کے کوئی خاص خوبی نہیں۔"[۲] ان کی مثنوی 'صبح امید' اور نظم "شہر آشوب اسلام" اردو ادب کی کم نظیر تخلیقات ہیں۔ مثنوی میں جدید تعلیم کے بیان میں سر سید احمد خان کی ان مساعی کو سراہا گیا ہے جن کی بدولت علی گڑھ کے معروف مدرستہ العلوم مسلمانان کی بنیاد رکھی گئی تھی اور نظم میں ہنگامۂ طرابلس و بلقان کا ولولہ انگیز بیان ہے۔ 'شہر آشوب' مسلمانوں کی سیاسی عظمت کے انحطاط کا نوحہ ہے اور مسلمانانِ جہاں کے لیے مہمیزِ عمل بھی۔

فارسی شاعری

شبلی کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری کے مقابلے میں زیادہ متنوع ہے، اگرچہ مثنوی 'صبح امید' اور 'شہر آشوب اسلام' نے ان کی اردو شاعری کو بنہایت موقر بنا دیا ہے۔ فارسی شاعری میں شبلی

۲؎ کلیاتِ شبلی اردو، طبع سوم، علی گڑھ ۱۹۴۰ دیباچہ ص،

کے زوردار ترکیب بند، قوت وصف و توصیف کے آئینہ دار قصائد، دل گداز مرثیے، دلآویز قطعات اور فصاحت و بلاغت کی عکاس غزلیات دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس حصے میں بعض طویل بیانیہ نظمیں موجود ہیں جن میں شاعر کی قوتِ خطابیہ کا اعجاز نمایاں ہے۔ ان کی اردو شاعری صنفِ غزل سے تقریباً عاری ہے جب کہ فارسی شاعری کا نمایاں ترین عنصر غزل ہے۔

شبلی کی فارسی غزلیات کی تعداد سو سے متجاوز ہے اور اشعار کی تعداد کوئی آٹھ سو ہے۔ غزلوں کا بیشتر حصہ ۱۹۰۶ تا ۱۹۰۸ میں لکھا گیا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب حساس شبلی شہر بمبئی کے حسین ماحول روح پرور مناظر اور کافر ادا حسینوں کی جلوہ سامانیوں سے متمتع تھے۔ انھوں نے متعدد غزلوں میں ان امور کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً:

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را   طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را
بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ دلی پرما   گرہ شستن از سرہ مشکل افتاد است رہرو را
فغان از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زرتشتی   بہم آمیختہ اززلف و عارض ظلمت و نور آ[۳]

گردم از مدحتِ شیراز و صفاہان زدہ ام   شرم بادم کہ نواہای پریشان زدہ ام
بمبئی بود مرا منزلِ مقصود و ہنوز   پیش ازیں گام طلب در رہِ حرمان زدہ ام

زذوقِ طبعِ شبلی من در اول روز دانستم   کہ در آشوب گاہ بمبئی در بازد ایمان را
بیا اینجا کہ ہر سو کاروان در کاروان بینی   بتانِ آزری را، دلبرانِ شام و ایران را

یہی نہیں وہاں انھوں نے ایک شوخ نکتہ داں، صنمِ زیبا، ماہِ تمام، نگارِ عجمی اور پادشاہِ کشورِ حسن کے حسن اور دلبرانہ اداؤں سے مسحور ہو جانے کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً:

کارم افتاد بہ آں پادشہِ کشورِ حسن   دست رد بر حشم قیصر و خاقان زدہ ام
آں نگارِ عجمی، چہرہ بہ انسان افروخت   کہ آتش آوردم و در خرمنِ ایمان زدہ ام

---

[۳] زرتشتیوں کے عقائد، نور و ظلمت، کی طرف اشارہ ہے۔

آں شد ای دوست کہ آراستی پیکرِ فن — نقشِ زیبا صنمی بر ورقِ جان زدہ ام
کس چہ داند کہ بخلوت گہِ آں ماہِ تمام — زدہ ام ساغر و بر یادِ حریفان زدہ ام

بیاراں آشکارا گفتہ ام این حرف و پنہان ہم — کہ شوخی، نکتہ دانی بردہ از من عقل و ایمان ہم
مدہ از دستِ خود رنگین نوابی ہم چو شبلی را — تو شاہِ محسنی و در کار داری یک غزل خوان ہم

اس پادشاہِ حسن کی ۱۹۰۷ء میں عمر بیس سال تھی اور شبلی اور اس کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے[۱] یہاں مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ شاعر کی صداقتِ بیان ملاحظہ ہو کہ آپ اسے 'نوبرِ حسن' اور 'نوجوان' کے القاب سے یاد کرتے اور ابہام کی گنجائش سے حتی الامکان گریز کرتے نظر آتے ہیں:

دل بہ آں نوبرِ حسن ارند ہم خود چکنم — دلم از صحبتِ پیرانِ ریا ساز گرفت
مرا از پیرِ گردوں شکوہ ای نیست — کہ با من ہر چہ کرد آں 'نوجوان' کرد

شبلی کی فارسی غزل کی زبان اور ادائے بیان بے حد سادہ، رواں اور دلآویز ہے۔ یہاں ہم نے بعض ایرانی فضلا سے شبلی کی فارسی سرائی کا ذکر کیا اور ایک محفل میں حافظ کی زمین میں علامہ موصوف کی وہ غزل پڑھی جس کے تین شعر اس سے قبل نقل ہو چکے اور باقی دو یہ ہیں:

"بدہ ساقی مئی باقی کہ در جنت نخواہی یافت" — کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را
بیا شبلی بہ یادِ پنجہ گیرای مژگانش — دگر رہ پارہ سازم این قبای زہد صد تو را

تو سامعین عش عش کر اٹھے۔ محمود منشی کاشانی ایک معروف شاعر و ادیب ہیں، بولے، ہمیں خبر نہ تھی کہ قرنِ حاضر میں علامہ اقبال کے علاوہ برصغیر کے کسی دوسرے شاعر نے بھی ایسے برجستہ اور دلپذیر اشعار فارسی میں لکھے ہیں۔

شبلی کی فارسی غزل عشق و سرمستی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں بیشتر معاملاتِ عشق و عاشقی ہیں لیکن زیادہ تعجب آور زبان و بیان کا اسلوب و لہجہ ہے۔ شبلی اصلاً عربی زبان و ادب کا عالم بے عدیل اور

---

[۱] دیکھیے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کی 'یادگارِ شبلی' مطبوعہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔ ص ۳۰۴ تا ۳۴۲ میں عطیہ بیگم کا ذکر

اس کی فارسی شاعری عربی کلمات سے تقریباً یکسر عاری ہو۔ نہ صرف یہ امر بلکہ فارسی کے وہ الفاظ جو برِعظیم میں متداول ہیں مگر اہلِ زبان خصوصاً اہلِ ایران کی خاطر نادر المعنی ہیں، وہ بھی شبلی کی فارسی شاعری خصوصاً غزل فارسی میں شاذ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کو بھی اپنی فارسی غزل کی دلآویزی کا احساس تھا۔ اسی لیے فخریہ انداز میں کہتے ہیں:

ایں غزل اول فیض اثر بمبئی است[۵]　　　باش تا بادۂ ایں میکدہ در جوش آید

در سخن با خاکیانِ ہند می سنجی مرا؟　　　ہی چہ میدانی کہ ایں فن را چہ سامان کردہ ام

ہمان کردہ از سخن در ہند شبلیؔ　　　کہ صائبؔ در سوادِ اصفہان کرد

شبلی ایں فن دہ بہ ایں شیوہ د آئین بودہ است　　　پیش ازیں کالبدی بود کہ من جان کردم

در حیرتم کہ پاکیٔ گفتارش از کجا ست؟　　　شبلیؔ مگر ز مردمِ ہندوستان نبود؟

بات دراصل یہ ہے کہ غزل سرائی کے دنوں میں شبلیؔ اپنی لاجواب تصنیف 'شعر العجم' کی ترتیب و تالیف میں مصروف تھے۔ اس لیے شعرائے فارسی کی بعض دلپذیر زمینیں انھوں نے بہ سہولت انتخاب کیں اور اپنے سحابِ طبع کے فیضان سے ان میں دل پسند اور بغایت مرغوب مضامین کی کشت کاری فرمائی۔ انھوں نے کئی غزلوں میں سعدیؔ، حافظؔ، ملک قمیؔ، نظیریؔ نیشاپوری، صائبؔ اور حزیںؔ لاہیجی کے تتبع کا ذکر کیا ہے۔ شعرائے مذکور کے دواوینِ غزل دیکھیں تو ان کی زمینیں شبلی کے ہاں موجود نظر آتی ہیں۔

دلبرانِ جور بورز ندو جفا نیز کنند　　　وین جز افسانہ نباشد کہ وفا نیز کنند

گر خداوندی ہوس داری در اقلیمِ سخن　　　بندگیٔ حافظِ شیرازمی بایست کرد

---

[۵] یہ غزل ۹ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھی گئی تھی۔

شبلیا کیست کند دادِ سخن می خواہی؟   گر نظیری نبود، شیخ حزین می باید

قرنِ حاضر کی اردو یا فارسی غزل، تغزل اور وارداتِ عشق و محبت کے لیے محدود نہیں رہی مگر شبلی کی فارسی غزلیں بیشتر مسلسل نوعیت کی ہیں۔ ان غزلوں میں شاعر نے زاہد و ملا پر طنز کیے ہیں اپنے تقوے کے دیوالیہ ہو جانے کا ذکر کیا اور اسی قسم کے مضامین پر اکتفا کیا ہے۔ ان غزلوں میں فکری موضوعات مفقود ہیں مگر غزل کے کلاسیکی اور اصل مضامین بے نظیر و کم عدیل نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں درجِ ذیل ہیں۔

من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چہ کنم ؟   میل با لالہ رخان گر نکنم تا چہ کنم !
ہست چہل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش   گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقوے چہ کنم
ما یۂ تقویِ سی سالہ فراہم شدہ است   ارمغانش بہ نگاری بدہم یا چہ کنم
شاہد و بادہ و طرفِ چمن و جوشِ بہار   شبلیا خود تو بفرما کہ بہ اینہا چہ کنم ؟

امتی نماند خلوتنشیانِ حجاز را   دیدی تطاولِ خمِ زلفِ دراز را
لعلِ لبش اگرچہ بکامم شکر نریخت   با ما سری است، آں نگہِ حیلہ ساز را
آور بہم کہ کار ز اندازہ بر گزشت   دستِ دراز گشتہ و آغوشِ باز را
ناوک بزد بہ غیر و مرا بر جگر نشست   قربان شوم خطای نگہ ہای ناز را

ای آنکہ ہمی گوئی کز راز خبر دارم   اندیشۂ خامی ہست من نیز بہ سر دارم
ای معتکفِ کعبہ ایں جلوہ فروشی چیست؟   من ہم بہ سر کوئی گہ گاہ گذر دارم

حدیثی ایں چنیں کم اتفاق افتادہ دوران را   کہ من نادان و ناصح ہست نادان تر نادان ہم
دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبی ست سالک را   خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوی ایمان ہم

شاعرِ اسلام

شاعری تو تفنن کے طور پر کر لی، مگر شمس العلما شبلی نعمانی کے دائرہ کار کا نقطۂ مرکزی اسلام رہا

ہے۔ ان کی ذولسانی شاعری کے بیشتر موضوعات دین مبین سے مربوط و منوط ہیں۔ اردو شاعری میں شبلی نے تاریخ اسلام کے کئی معروف و کم معروف واقعات کو نظم کیا ہے[۲۶]۔ ان کے قصائد میں بعض مسلمان شخصیات کے کارہائے خیر پہ کو خراج تحسین کے طور پر ہیں[۲۷]۔ خلافتِ اسلامی سے مسلمانوں کی وابستگی واضح ہے شبلی کو مرکزِ خلافت سے چونکہ قلبی وابستگی تھی، اس لیے انھوں نے خلیفۂ عثمانی عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ - ۱۹۰۹) کی تعریف میں کئی قصائد لکھے ہیں۔ کچھ قصائد ان کے قیام استنبول (۱۸۹۲) کی یادگار رہیں اور بعض اس سے قبل یا بعد لکھے گئے ہیں۔

عالمِ اسلامی کے معاصر واقعات پر شبلی نے کافی لکھا ہے۔ ریاست ہائے بلقان اور طرابلس کی جنگوں سے وہ شدت سے متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ ترکوں سے مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا تھا:

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے

پشت و پناہِ ملتِ خیر الامم ہے تو — تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے

تو نے دکھا دیا کہ تری تیغِ جانستان — اب بھی فنائے ہستیِ دشمن کا راز ہے

ان کے "شہر آشوب اسلام" کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حکومت پہ زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک؟ — چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے — یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

---

۲۶ مثلاً حیات سیدۃ النساء فاطمہؓ، ہجرتِ رسولؐ، تعمیر مسجدِ نبویؐ، واقعاتِ بدر و احد، عدلِ عمر فاروقؓ، سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ، خواتینِ عرب کا استقلالِ مزاج اور عدلِ جہانگیری وغیرہ (تمام اردو نظمیں)

۲۷ جیسے نظام حیدر آباد دکن، سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال اور بیگم صاحب جزیرہ جنشان کا تشکر۔

کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی / دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے / تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی / چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک؟

شبلی دنیائے اسلام کے انحطاط پر خون کے آنسو روتے اور مسلمانوں کو تاریخِ اسلام کے درخشاں ماضی کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ یہ وہی کام ہے جسے ان کے معاصرین حالی اور اکبر نے بھی انجام دیا اور قومی شاعری کی۔ اس لئے کو اقبال کے نغمات نے احیائے مسلمین کی خاطر صورِ اسرافیل بنا دیا۔ شبلی کی نظر میں مسلمانوں کے انحطاط کا سبب خود مسلمان ہیں۔ وہ اسلامی تعلیمات سے روگرداں ہیں۔ مگر بعض جاہل اپنے انحطاط کو اسلام سے منسوب کر دیتے ہیں۔

بحثِ ماضیہ میں پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ / جس کو اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں
آپ کھانے کو بنا دیتے ہیں پہلے مسموم / پھر یہ کہتے ہیں غذا موجبِ اسقام نہیں
ان حقائق کی بنا پر بسببِ پستیٔ قوم / ترکِ پابندیٔ اسلام ہے، اسلام نہیں

شبلی نے ان علما پر بھرپور تنقید کی ہے جو فروعات میں الجھتے، ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کی تکفیر کرتے، مذہب و سیاست میں تفریق کی باتیں کرتے اور افتراق و نفاق کا موجب بنتے ہیں۔ انھوں نے بجا فرمایا کہ مسلمانوں کے انحطاط کا ایک سبب علما کی تنگ نظری اور ان کا شغلِ تکفیر ہے۔

۱۹۱۲ میں مچھلی بازار شہر کانپور کی ایک مسجد کے ایک گوشے کے انہدام کا دردناک واقعہ پیش آیا جس پر احتجاج کے دوران کئی مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اس درد انگیز واقعہ کے بارے میں شبلی نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دلگداز اشعار کہے اور اپنی قوتِ ایمانی کا ثبوت دیا۔ ان کی ایک نظم کا یہ مصرعہ

ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

ایک ضرب المثل کی مانند معروف رہا ہے۔ شبلی ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی / دگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں / کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

تعلیم

شبلی نعمانی مدتوں معلم واستاد رہے، مگر تعلیم وتربیت کے موضوع سے ان کی دلچسپی پیشہ ورانہ تعلق سے کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔ دراصل ان دنوں سرسید احمد خاں نے مدارس کی تاسیس اور امورِ تعلیم پر بحث ومباحثہ کی فضا قائم کرکے مسلم زعما کو ان مسائل پر غور وفکر کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ شبلی ۱۸۸۲ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں وارد ہوئے اور چار سال بعد انھوں نے تعلیم کے موضوع پر اپنی پہلی تحقیقی تصنیف[1] پیش کی۔ ازاں بعد وہ اپنے ایامِ آخر تک مدرسۃ العلوم علی گڑھ، محکمہ تعلیم حیدرآباد دکن، ندوۃ العلما لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے ذریعے تعلیم وتربیت کے موضوعات سے ہی وابستہ رہے۔ اس موضوع پر ان کے پُرمغز مقالات کو 'رسائل شبلی' اور 'باقیاتِ شبلی' نام کے مجموعوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کا معتدبہ حصہ بھی اسی مضمون سے متعلق ہے۔
مثنوی 'صبحِ امید' میں مسلمانوں کی تعلیمی فتوحات کا ذکر ہے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی حمایت کے ضمن میں جدید تعلیم اپنانے کا بیان ہے۔

سہتے ہیں جو یوں غم و تعب ہم — تدبیر یہی ہے بس کہ، اب ہم
تقویمِ کہن سے ہاتھ اٹھائیں — تہذیب کے دائرے میں آئیں
سیکھیں وہ مطالبِ نو آئیں — یورپ میں جو ہو رہے ہیں تلقیں
تہذیب کے وہ اصولِ نایاب — وہ طرزِ معاشرت کے آداب

'مسلم یونیورسٹی وفدِ حمایت' کے ایک اجلاس منعقدہ لاہور میں آپ نے فرمایا تھا:

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد — کہ ایں سررشتۂ تعلیم با دستِ ما باشد
علومِ تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم — الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد

لیکن بعد میں جب شبلی نے دیکھا کہ جدید تعلیم کے نتیجے میں مسلمان طلبہ اپنے تاریخی ورثے سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں اور اگرچہ انھیں 'سندوں' کا زعم ہے مگر معلومات سے کورے ہیں تو انھوں نے قدیم وجدید تعلیم کے اختلاط وامتزاج کے لیے کوششیں کیں۔ ندوۃ العلما لکھنؤ سے

---

[1] یعنی مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم

مولانا مرحوم کی وابستگی اسی کوشش کا مظہر تھی اور علی گڑھ ۔ ندوہ کشمکش' کی ایک بڑی علت بھی یہی تھی ۔ قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی کے بارے میں بقول اُنکے 'خذ ما صفا ودع ما کدر' شبلی نے اپنے خیالات ایک فارسی ترکیب بند میں ظاہر فرمائے جو ندوۃ العلماء کے اجلاس عام منعقدہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۲ بمقام امرتسر میں پڑھا گیا تھا:

چارۂ آں نیست کہ بر رسم کہن طرح نہی — مکتب و مدرسہ ہا در ہمہ اطراف و بلاد
تا چہ سودت دہد آں فلسفۂ عہدِ قدیم؟ — تا چہ سودت دہد آں ہیئتِ پارینہ نہاد
تا چہ سودت دہد آن شیوۂ تعلیم قدیم — کہ بروئیت درِ رزقی نتوانست گشاد؟
ایں نہ خواری بود آخر کہ پس از کسبِ علوم — از رہ وعظ بہ دریوزہ برآئی ناشاد؟
دست بالاست ہر آئینہ ز زیرین بہتر — ایں حدیثِ نبویؐ ہست ترا رفتہ زیاد
نتوانی کہ خود از گوشہ برآئی و آنگہ — عرض اسلام کنی در ہمہ امصار و بلاد؟

ای کہ بر مائدہ یورپ مہمان باشی — حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیان — منکرِ فلسفۂ سنت و قرآن باشی
گفتۂ سولن و آئینِ جہانبانیِ او — بر زبان داری و بیگانہ ز نعمانؓ باشی
از ہنی بال صد افسانہ و دستان گوئی — جاہل از معرکہ ہائے شہِ مردانؓ باشی
قیصران را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز — بی خبر از عمرؓ و حیدرؓ و عثمانؓ باشی
ور بپرسی کہ درین کار چہ تدبیر بود؟ — دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

جملہ ہائے معترضہ کے طور پر عرض کر دیں کہ 'قدیم وجدید' تعلیم کا آمیزہ تیار کرنا ۔ اس صدی میں بیشتر مسلم زعماء و مفکرین کی کوششوں کا مرکز رہا ۔ مگر ہنوز کوئی معیاری لائحہ عمل سامنے نہ آیا جسے ہم اور سارا عالمِ اسلام اپنا سکے ۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے :

کھلے ہیں سب کے لیے غربیوں کے میخانے — علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

چند جدتیں اور تنوعات

شبلی کی ایک جدت یہ ہے کہ اردو اور فارسی شاعری میں انھوں نے بھرپور خطابیے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے منظوم خط لکھے اور لکھنؤ سے حیدرآباد دکن اور علی گڑھ سے استنبول تک کے اپنے سفرنامہ کو بالاجمال فارسی شعر میں بیان فرمایا ہے۔ ان کی دوسری جدت ہمیں یہ نظر آئی کہ اپنی بعض کتابوں کے دیباچے اور تعارف بھی بزبان شعر لکھے ہیں۔ ان دیباچوں میں مؤلف نے خاکساری برتتے ہوئے بھی اپنی عرق ریزی پر فخر کیا ہے۔ مثلاً "الفاروق" کے دیباچے میں ہے:

ہم نشیں نکتۂ حکمت زشریعت می جست — نحتی از نسخۂ روح القدس املا کردم
شاہد را زکرکس پردہ ز رویش نگرفت — گرہ از بند قبایش بہ فسوں وا کردم
بسکہ ہر بار گہر پاش گزشتم زیں راہ — دشت معنی ہمہ پر لولوی لا لا کردم

یہ بیان محض فخریہ ہی نہیں حقیقت کا غماز ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت و کارناموں کے بارے میں شبلی سے قبل اور بعد بہت کچھ لکھا گیا مگر "الفاروق" کا سا جوش بیان اور عمق کسے ملا ہے؟

شبلی کے مختصر قطعات بے حد پُر معنی اور دلآویز ہیں۔ دو دو شعر کے قطعوں میں رباعی کا سا تسلسل و عمق ملتا ہے مثلاً اپنی سیرت النبیؐ کے آغاز پر تحدیث نعمت کے حاصل مندرجہ ذیل دو قطعے۔

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالمؐ — دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامینؑ لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی — کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز، لکھتے تو ہمیں لکھتے

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں[۹] لکھی[۱۰] — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ شبلی کے مطائبات بزبان شعر کم ملتے ہیں مگر جو ہیں بے نظیر ہیں۔ عطیہ بیگم کی شادی پر

۹؎ شعر العجم (۵ جلد) مراد ہے۔
۱۰؎ المامون (دو جلد) کی طرف اشارہ ہے۔

تین شعر ملاحظہ ہوں۔ پہلے شعر میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مشار الیہا کی شادی ایک نومسلم یہودی سے ہوئی اور دوسرے دو شعروں میں اس کے نقاش و مصور ہونے کی مناسبت سے (بزبانِ عطیہ) لفظ 'کھینچنے' کے تلازمات ملتے ہیں۔

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
'عطیہ' کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

'کھینچ' سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لیے ننگِ قرابت سے مجھے دوری تھی

آپ 'نقاش' ہیں اور حُسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے مجھ کو جو 'کھینچا' تو یہ مجبوری تھی

مئی ۱۹۰۷ میں بندوق کی ایک گولی کی ضرب سے، جو غلطی سے ان کے ہاتھ سے چل گئی، شبلی کا ایک پاؤں جاتا رہا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ بعد ان کے دوست اکبر الہ آبادی نے انھیں الہ آباد آنے کی دعوت دی اور شبلی نے مطائبتاً فرمایا۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے 'تیمور' ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

قصائد

شبلی کے قصائد کی طرف اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے بہاریہ اور وصفیہ قصائد میں شاعر کی تغزل و توصیف کی قوتیں بے حد دلآویز نظر آتی ہیں۔ اشخاص کے مدحیہ قصائد میں دیگر فنی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، مگر ہم یہاں زیادہ مثالیں نقل کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ان کے قصیدۂ کشمیریہ (۱۸۹۸) کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

بسکہ جوشید ز ہر سوی گل و لالہ بدشت
از کران تا بہ کران، روی زمین ناپیداست

ہیچ جائی ز گل و لالہ تہی نتوان یافت
پای دیوار اگر ہست و گر سقف سراست

جادہ را خود ز خیابان نتوان کرد تمیز
بسکہ گل صف زدہ سرتا سر او از چپ و راست

جامِ گل رنگ کہ در بزم بآئین چیدند
ہم بدان گونہ گل، از پہلوی گل جلوہ نماست

سبزہ برکوہ فرو ریختہ از سر تا بن یا قبائی است کہ بر قامتِ شخص آید راست
دیدۂ طفل کہ بر دامنِ مادر غلطد ! جنبشِ باد، بدانگونہ بروی صحراست
گل بہر شاخ ز برگ است فزوں تر گوئی ہمہ برگِ گل بفزود آنچہ کہ از برگ بکاست
سرو اگر پای بدامن نکشد، خود چہ کند زانکہ از جوشِ گل و لالہ چمن تنگ فضاست
بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغی بنہند در شبِ تار کسی گم نشود از رہِ راست

سیاسی شاعری

شبلی کی فارسی شاعری، سیاسیات سے تقریباً عاری ہے۔ ان کی اردو شاعری میں البتہ سیاسی نظمیں ملتی ہیں۔ اس حصے میں عالمِ اسلام کے واقعات پر تبصرہ، برعظیم کے معاصر سیاست دانوں پہ ردّ و کد اور استعماری قوتوں (بالخصوص انگریزوں) پر انتقادات ملتے ہیں اور مولانا کی کوئی نصف اردو شاعری ان ہی مضامین کے لیے وقف نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض باتوں کا ذکر "شاعرِ اسلام" کے ذیلی عنوان کے تحت ہو چکا ہے۔

۱۹۰۵ میں بنگال ہندو اور مسلمان اکثریت والے علاقوں میں منقسم ہو گیا تھا مگر ملک کی ہندو اکثریت کے دباؤ کے تحت ۱۹۱۱ میں انگریزوں نے تقسیم مذکور کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ مسلمان انگریز کی اس بدعہدی سے بے حد غمگین ہوئے تھے۔ مولانا نے شبلی سے فرمایا۔

جنابِ لاٹ از فرمودۂ خود بر نمی گردد کہ تمکینِ حکومت را سیاست بیشتر باید
ولی در قسمتِ بنگالہ ایں اندیشہ می بایست کہ دگر بہ کشتی اول روزی بایدۂ اگر باید

ایک دوسرے قطعے میں مسجدِ کانپور کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یو پی کے انگریز گورنر کی بات کا یوں استہزا کرتے ہیں:

حضرتِ لاٹ بفرمود کہ فرمان فرمای نیست ممکن کہ دگر بگزرد از گفتۂ خود
صدرِ اعظم بسزن قسمتِ بنگالۂ شرق نگہی کرد و بفرمود کہ من کردم و شد

علی گڑھ تحریک اور ندوۃ العلماء کے فتنوں پر بھی مولانا نے انتقادات کیے ہیں۔ ملکی سیاسی جماعتوں پر ان کا اظہارِ نظر بھی کئی نظموں میں ملتا ہے۔ مگر کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ پر ان کا عتاب زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر برعظیم کی سیاست کو بے معنی جانتے اور یہاں کی قیادت کو "گفتند و برخاستند" کی تعبیرات سے بیان

کرتے تھے۔ حزبِ احرار کے ذکر میں فرماتے ہیں:

غوں غاں ہے، کچھ مباحثِ ملکی نہیں ہیں یہ | اک طفل ہے، سیاستِ ہندوستان ابھی

کانگرس کے قیام کے چار سال بعد، اس کی کارروائیوں کے بارے میں شبلی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

هر چه گفتیم و شنیدیم بجای نرسید | گرچه صد بار بگفتیم، باز بگوئیم دگر
هیچ از ناوک تدبیر نیامد به نشان | همه بگذار، همین 'کانگرس' را بنگر
چار سال است که این جاده نوردیم و هنوز | حاصلِ ما نبود زان همه جز بوک و مگر
تا چه سود است که در عرصۂ سالی دو سه روز | مصرعی چند بیافند و بخوانند از بر
دو سه بحثی که گزینند بیا بانِ سخن | جمله دارند قبولش که ازین نیست مفر
بعد ازاں کآنهمه هنگامه نشینند از پای | بزم برهم شود و خلق شود راهسپر!
آن سخن ها همه افسانه و افسون گردد | آن بناها همه یکبار شود زیر و زبر
خود همین است گر آئینِ طلبگاریِ ما | وای بر ما و برین هرزه‌زبان کاریِ ما

مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس کی ممبری مسلم اعیان و اکابر، نوابوں اور اشراف تک محدود رہی۔ اس جماعت کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ تھا اور اس مقصد کی خاطر اسے ہندو اکثریت سے مقابلہ کرنا تھا۔ یہ مقابلہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا تھا کہ سرکارِ انگریزی، مسلمانوں کو قابلِ التفات جانے۔ اس نقطۂ نظر سے مسلمانوں نے ابتداً حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کی پالیسی اختیار کی اور کم از کم شبلی کی وفات (۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) تک ان کی یہی روش رہی۔ اس زمانے میں تنسیخ تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا، مسجد کانپور کا متوضی منہدم کیا گیا، بلقان اور طرابلس کی جنگیں شروع ہوئیں مگر مسلمانوں کی یہ جماعت من حیث الجماعت ایسی بات بہت کم کہہ سکی جو حکومت کے عندیے کے خلاف ہو۔ انفرادی کوششیں البتہ جاری رہیں کہ ان معاملات میں مسلمانوں کی آواز حکومت کے گوش گزار ہو۔ یہی وہ حالات تھے جن میں شبلی نے اس جماعت کے خلاف لکھا، اور بہت لکھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ جماعت عوام تک رسائی حاصل کرے اور حکومت کے خلاف علی الاعلان کہنے لگے۔ ان کا یہ خیال غلط نہ تھا کیونکہ بعد میں اس جماعت نے یہی پالیسی

اختیار کی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ شبلی کے چند ناقدانہ اشعار ملاحظہ ہوں:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں ۔۔۔ ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے، کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ ۔۔۔ نظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر ۔۔۔ اس میں زہاد بھی ہیں، رندِ مئے آشام بھی ہے
فیض اس کا ہے باندازۂ طالب یعنی ۔۔۔ بادۂ صاف بھی ہے، دُردِ تہِ جام بھی ہے
صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُرآب ۔۔۔ دل میں غمخواریِ ترکانِ نکو کام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں ۔۔۔ محسنِ قوم بھی ہے، خادمِ حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی ۔۔۔ جس طرح "صرف" میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے
ہے تو سب کچھ مگر ایک گزارش ہے حضور ۔۔۔ گرچہ یہ سُوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ میرے کان میں ارشاد ہو یہ ۔۔۔ سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے؟

لوگ کہتے ہیں کہ آمادۂ اصلاح ہے لیگ ۔۔۔ یہ اگر سچ ہے، تو ہم کو بھی کوئی جنگ نہیں
صیغۂ راز سے کچھ کچھ یہ بھنک آتی ہے ۔۔۔ کہ ہم آہنگیِ احباب سے اب ننگ نہیں
فرق اتنا تو بتا ہر نظر آتا ہے ضرور ۔۔۔ اب خوشامد کا ہر ایک بات میں وہ رنگ نہیں
سال میں یہ جو تماشا سا ہوا کرتا ہے ۔۔۔ کام کرنے کا یہ انداز نہیں، ڈھنگ نہیں
کچھ تو نظم و نسقِ ملک میں بھی دیجیے دخل ۔۔۔ شیوۂ حق طلبی ہے، یہ کوئی جنگ نہیں
کم سے کم حاکمِ اضلاع تو ہوں اہلِ وطن ۔۔۔ کیا ہزاروں میں کوئی صاحبِ فرہنگ نہیں؟
لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک؟ ۔۔۔ یہ تو کہیے کہ عمل کی بھی بنا ڈالی ہے؟
ایک صاحب نے کہا، آپ نہ گھبرائیں ابھی ۔۔۔ 'حال' بھی آئے گا، اب تک تو یہ 'قوالی' ہے

حضرت شبلی کے اردو فارسی مجموعہ ہائے کلام کے دورانِ مطالعہ[۱] میں یہ چند سطور قلم بند کی گئی ہیں۔

ظاہر ہے کہ مولانا مرحوم کی نغز و پُرمغز شاعری اس سے زیادہ توجہ کی متقاضی ہے۔

---

[۱] دیکھیے حاشیہ الف۔ فارسی میں دیوانِ شبلی، دستۂ گل، بوئے گل اور برگِ گل پیشِ نظر ہیں۔